ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 405

Program: B.A

Semester: Autumn 2026

WhatsApp Orders: +92 324 5836626

ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY, ISLAMABAD

Course: Iqbaliyat (405) • Level: B.A.

Semester: Autumn 2026

Assignment No. 2 (Units 6–9)

SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

(For Study & Reference)

Note: This guide is prepared for study and reference purposes. Students are advised to read the relevant units of the course book, understand the ideas, and then write the assignment in their own words. Direct copying is discouraged.

کورس :اقبالیات — (405) سطح :بی اے — سمسٹر :خزاں — 2026 امتحانی مشق نمبر) 2 یونٹ 6 تا — (9 کل نمبر100 :، کامیابی کے نمبر40 :

سوال نمبر :1 مختصر سوالات کے جوابات) تصویرِ درد، خضرِ راہ، طلوعِ اسلام 20) (نمبر(

سوال نمبر :1 درج ذیل سوالات کے مختصر جواب تحریر کریں۔ (1) نظم تصویرِ درد اقبال کے کس شعری مجموعے میں شامل ہے؟ (2) نظم خضرِ راہ میں کتنے کردار ہیں؟ (3) نظم خضرِ راہ اقبال کے کس شعری مجموعے میں شامل ہے؟ (4) علامہ اقبال نے اپنی نظم خضرِ راہ کس انجمن کے جلسے میں پڑھی تھی؟ (5) نظم خضرِ راہ میں کس زمانے کے مسائل کا ذکر ہے؟ (6) نظم طلوعِ اسلام اقبال کے کس شعری مجموعے میں شامل ہے؟ (7) اقبال نے اپنے فلسفۂ خودی کو اپنے کس فارسی شعری مجموعے میں مکمل طور پر بیان کیا ہے؟ (8) اقبال نے اپنے کس فارسی شعری مجموعے میں بے خودی کے نظریے کو تفصیل سے بیان کیا ہے؟ (9) استعارہ سے کیا مراد ہے؟ (10) اقبال کا کوئی ایسا شعر درج کیجیے جس میں استعارہ موجود ہو۔(2x10=20)

تمہید و تعارف

یونٹ 6 تا 9 میں اقبال کی تین نمائندہ نظمیں تصویرِ درد، خضرِ راہ اور طلوعِ اسلام شاملِ نصاب ہیں، اور ان کے ساتھ اقبال کی فارسی مثنویوں اور علمِ بیان کی اصطلاحات کا مطالعہ بھی اسی حصے سے وابستہ ہے۔ یہ دس مختصر سوالات انہی موضوعات کی بنیادی معلومات جانچتے ہیں :نظموں کے مجموعے، ان کے کردار و پس منظر، فلسفہ خودی و بے خودی کے مآخذ اور استعارے کی تعریف و مثال۔ ان سوالات کی تیاری کے لیے ضروری ہے کہ طالب علم ہر نظم کا نام،

اس کا مجموعہ اور اس کے اہم واقعاتی پس منظر کو یاد رکھے۔ ذیل میں ہر سوال کا جواب الگ عنوان کے تحت دیا جا رہا ہے۔

(1)تصویرِ درد کا مجموعہ

نظم تصویرِ درد اقبال کے پہلے اردو شعری مجموعے بانگِ درا میں شامل ہے۔ بانگِ درا1924 ء میں شائع ہوا اور اس میں اقبال کی1905 ء سے قبل، یورپ کے قیام کے دوران اور اس کے بعد کی نظمیں تین حصوں میں ترتیب دی گئی ہیں۔ تصویرِ درد اقبال کے ابتدائی دور کی نظم ہے جس میں شاعر نے انسانیت کے دکھ درد اور خاص طور پر ملتِ اسلامیہ کی زبوں حالی کی تصویر کشی کی ہے۔ اس نظم میں اقبال ایک مصور کی طرح درد کی تصویر بناتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ یہ درد دراصل انسان کو بے حس ہونے سے بچاتا اور عمل پر آمادہ کرتا ہے۔ بانگِ درا کا نام بھی اسی لیے منتخب کیا گیا کہ یہ کاروانِ ملت کو جگانے والی گھنٹی) بانگ (کی حیثیت رکھتا ہے، اور تصویرِ درد اسی جگانے کے عمل کا ایک پُرسوز باب ہے۔

(2)خضرِ راہ کے کردار

نظم خضرِ راہ میں کل دو کردار ہیں :ایک شاعر یعنی خود اقبال، جو ایک مسافر کی حیثیت سے ساحلِ دریا پر حضرت خضر سے ملاقات کرتا ہے، اور دوسرے حضرت خضر علیہ السلام، جو مسائلِ زمانہ پر روشنی ڈالتے ہیں۔ نظم مکالمانہ انداز میں لکھی گئی ہے۔ ابتدا کے دو بند شاعر کے خطاب پر مشتمل ہیں جن میں وہ خضر سے زندگی کے رموز اور زمانے کے الجھے ہوئے مسائل کے بارے میں سوالات کرتا ہے، اور باقی بند جوابِ خضر کے عنوان سے ہیں جن میں خضر ہر سوال کا جواب دیتے ہیں۔ اقبال نے حضرت خضر کو اس لیے منتخب کیا کہ روایات میں خضر راہنمائی، آبِ حیات اور پوشیدہ حقائق کے جاننے والے کی حیثیت سے معروف ہیں؛ یوں یہ کردار اس نظم کی فکری رہنمائی کی علامت بن گیا ہے اور شاعر و خضر کا مکالمہ پوری نظم کی ساخت کو ڈرامائی حسن عطا کرتا ہے۔

(3)خضرِ راہ کا مجموعہ

نظم خضرِ راہ بھی اقبال کے پہلے اردو مجموعے بانگِ درا میں شامل ہے۔ یہ نظم1922 ء میں لکھی گئی اور بانگِ درا 1924)ء (کے تیسرے حصے میں جگہ پائی، جو1918 ء کے بعد کی نظموں پر مشتمل ہے۔ خضرِ راہ بانگِ درا کی طویل اور اہم ترین نظموں میں شمار ہوتی ہے، کیونکہ اس میں اقبال نے محض جذبات کا اظہار نہیں کیا بلکہ اس دور کے تمام بڑے سیاسی، سماجی اور تہذیبی مسائل کو باقاعدہ فکری نظام کے تحت پیش کیا ہے۔ نظم کے ذیلی عنوانات، مثلاً دنیائے

اسلام، سلطنت، سرمایہ و محنت اور زندگی و موت، اسی جامعیت کی دلیل ہیں۔ بانگِ درا میں اس نظم کا مقام یہ ہے کہ یہ مجموعے کے آخری دور کی فکری پختگی کو ظاہر کرتی ہے اور اقبال کی بعد کی شاعری کے موضوعات کی پیش بندی بھی کرتی ہے۔

(4)خضرِ راہ کس جلسے میں پڑھی گئی؟

علامہ اقبال نے اپنی نظم خضرِ راہ انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے میں پڑھی تھی۔ یہ انجمن کے سینتیسویں سالانہ اجلاس کا موقع تھا جو 12 اپریل1922 ء کو اسلامیہ ہائی سکول، اندرون شیرانوالہ دروازہ، لاہور میں منعقد ہوا۔ مولانا غلام رسول مہر کی روایت کے مطابق یہ نظم سننے کے لیے تقریباً بیس ہزار کا مجمع جمع تھا، اور بہت سے اشعار پر اقبال خود بھی اشکبار ہوئے اور سامعین بھی رونے لگے۔ انجمن حمایتِ اسلام لاہور کی قدیم ترین مسلم فلاحی تنظیم تھی جس کے جلسے اس دور میں قومی بیداری کا مرکز ہوتے تھے اور اقبال کی متعدد مشہور نظمیں انہی جلسوں میں پہلے پہل پڑھی گئیں۔ خضرِ راہ کی مقبولیت کا یہ جلسہ اس لیے بھی یادگار ہے کہ اس نے اقبال کو عوامی سطح پر ملت کا ترجمان شاعر بنا کر پیش کیا۔

(5)خضرِ راہ میں کن زمانے کے مسائل کا ذکر ہے؟

نظم خضرِ راہ میں اقبال نے اپنے زمانے یعنی پہلی جنگِ عظیم کے بعد کے دور کے مسائل کا ذکر کیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سلطنتِ عثمانیہ ختم ہو رہی تھی، قسطنطنیہ پر اتحادی قابض تھے، یونانی افواج اناطولیہ میں اتر چکی تھیں، ہندوستان میں تحریکِ ہجرت اور خلافت و ترکِ موالات کی تحریکیں چل رہی تھیں اور روس میں اشتراکی انقلاب آ چکا تھا۔ نظم میں سرمایہ و محنت کی کشمکش، ملوکیت و جمہوریت کا سوال، مشرق و مغرب کی تہذیبی آویزش، غلامی کی وجوہات اور مسلمانوں کے زوال جیسے موضوعات زیرِ بحث آئے ہیں۔ اقبال کا کہنا ہے کہ ان مسائل کا حل نہ مغربی سرمایہ داری میں ہے نہ محض مادی اشتراکیت میں، بلکہ اسلام کے روحانی و اخلاقی نظام اور خودی کی بیداری میں ہے۔ اس لیے خضرِ راہ اپنے عہد کی مکمل فکری تاریخ کہلائی جا سکتی ہے۔

(6)طلوعِ اسلام کا مجموعہ

نظم طلوعِ اسلام بھی اقبال کے پہلے اردو مجموعے بانگِ درا میں شامل ہے۔ یہ نظم بانگِ درا کے تیسرے حصے میں آتی ہے اور1923 ء میں انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے میں پڑھی گئی تھی۔ اس نظم کی تخلیق کا پس منظر یونانیوں کے

مقابلے میں ترکوں کی فتح اور مصطفیٰ کمال کی قیادت میں ترکی کی آزادی کی جنگ کی کامیابی ہے، جسے اقبال نے پورے عالمِ اسلام کے طلوعِ نو کی نوید سمجھا۔ اسی لیے یہ نظم بانگِ درا کی سب سے پُرامید اور جوش انگیز نظموں میں سے ہے اور اس کا ہر بند مسلمانوں کو نئی صبح کا یقین دلاتا ہے۔ نظم کے اختتام پر دیا گیا درس سبق پھر پڑھ صداقت کا آج بھی اقبال کے پیغام کا خلاصہ سمجھا جاتا ہے۔

(7)فلسفۂ خودی کا مکمل بیان

اقبال نے اپنے فلسفۂ خودی کو اپنے فارسی شعری مجموعے اسرارِ خودی میں مکمل طور پر بیان کیا ہے۔ یہ فارسی مثنوی 1915ء میں شائع ہوئی اور مولانا رومی کی مثنوی کے اسلوب میں لکھی گئی۔ اس میں اقبال نے بتایا کہ خودی انسان کی ذات، انا یا شخصیت کا وہ جوہر ہے جس کی تربیت و تکمیل ہی زندگی کا مقصد ہے۔ کتاب میں خودی کی تربیت کے تین مراحل بیان ہوئے ہیں :اطاعت) احکامِ الٰہی کی پابندی(، ضبطِ نفس) خواہشات پر قابو (اور نیابتِ الٰہی) خدا کا نائب بن کر دنیا میں عمل کرنا(۔ اسی طرح اقبال نے وہ عوامل بھی بیان کیے جو خودی کو مضبوط کرتے ہیں، مثلاً عشق، فقر، سخت کوشی اور آرزو، اور وہ جو اسے کمزور کرتے ہیں، مثلاً سوال و گدائی، غلامی اور تقلید۔ اسرارِ خودی کے انگریزی ترجمے نے اس فلسفے کو عالمی شہرت دی۔

(8)بے خودی کا نظریہ

اقبال نے بے خودی کے نظریے کو تفصیل سے اپنے فارسی شعری مجموعے رموزِ بے خودی میں بیان کیا ہے، جو1918 ء میں شائع ہوا۔ اسرارِ خودی میں فرد کی ذات کی تعمیر تھی، جبکہ رموزِ بے خودی میں یہ واضح کیا گیا کہ فرد کی خودی کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب وہ اپنے آپ کو ملت میں ضم کر دے، یعنی خودی کی انتہا بے خودی ہے۔ اس مثنوی میں اقبال نے ملتِ اسلامیہ کی بنیادوں توحید، رسالت اور کتاب کو بیان کیا، ملت کو ایک زندہ جسم قرار دیا اور فرد کو اس کا رکن بتایا۔ انہوں نے مشہور مثال دی کہ فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں، موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں۔ یوں اسرار و رموز مل کر اقبال کے فلسفے کا مکمل نظام تشکیل دیتے ہیں جس میں فرد اور جماعت دونوں کی تربیت کا پروگرام موجود ہے۔

(9)استعارہ سے مراد

استعارہ علمِ بیان کی ایک اہم اصطلاح اور مجاز کی مشہور قسم ہے۔ لغوی طور پر استعارہ کے معنی عارضی طور پر کوئی چیز مانگنا ہے۔ اصطلاح میں استعارہ سے مراد کسی لفظ کو اس کے حقیقی معنی کے بجائے مجازی معنی میں استعمال کرنا ہے، بشرطیکہ مجازی معنی لینے کی بنیاد تشبیہ کا تعلق ہو اور کوئی قرینہ حقیقی معنی مراد لینے سے روکتا ہو۔ مثال کے طور پر بہادر آدمی کو شیر کہنا استعارہ ہے، کیونکہ یہاں شیر کا لفظ جانور کے بجائے بہادری کی صفت مشابہت کی بنیاد پر انسان کے لیے آیا ہے۔ استعارے سے کلام میں اختصار، مبالغہ، حسن اور تاثر پیدا ہوتا ہے۔ اقبال کے کلام میں استعاروں کا بے مثال استعمال ملتا ہے؛ شاہین، لالہ، نرگس، ساحل اور طوفان جیسی علامتیں دراصل استعارے ہی ہیں جو ان کے فلسفیانہ افکار کو حسی تصویروں میں ڈھال دیتی ہیں۔

(10)استعارے والا شعر

اقبال کا استعارے پر مشتمل مشہور شعر یہ ہے :تو شاہین ہے، پرواز ہے کام تیرا، تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں۔ اس شعر میں شاہین کا لفظ اپنے حقیقی معنی یعنی ایک شکاری پرندے کے لیے نہیں آیا بلکہ استعارۃً اس سے مراد مسلمان نوجوان یا مردِ مومن ہے۔ مشابہت کی بنیاد یہ ہے کہ جس طرح شاہین بلند پرواز، خوددار اور آزاد فضاؤں کا شائق ہوتا ہے، اسی طرح مسلمان نوجوان کو بھی بلند حوصلہ، خوددار اور مسلسل جدوجہد کرنے والا ہونا چاہیے۔ قرینہ یہ ہے کہ شاعر براہِ راست انسان سے مخاطب ہے، اس لیے یہاں شاہین سے حقیقی پرندہ مراد لینا ممکن نہیں۔ اقبال نے اپنے کلام میں شاہین کو مستقل استعارے کے طور پر اتنی کثرت سے استعمال کیا ہے کہ یہ لفظ اردو ادب میں نوجوانِ ملت کی علامت بن چکا ہے۔

خلاصہ و نتیجہ

یہ دس جوابات ان یونٹوں کا بنیادی ڈھانچہ پیش کرتے ہیں :تصویرِ درد، خضرِ راہ اور طلوعِ اسلام تینوں بانگِ درا کی نظمیں ہیں؛ خضرِ راہ دو کرداروں، شاعر و خضر، کا مکالمہ ہے جو1922 ء میں انجمن حمایتِ اسلام کے جلسے میں پڑھی گئی اور اپنے دور کے مسائل کا احاطہ کرتی ہے؛ خودی کا نظام اسرارِ خودی میں اور بے خودی کا رموزِ بے خودی میں بیان ہوا؛ اور استعارہ اقبال کے اظہار کا سب سے مؤثر آلہ ہے جس کی روشن مثال شاہین کا استعارہ ہے۔ یہ معلومات آگے کے تفصیلی سوالات کو سمجھنے کی بنیاد بھی فراہم کرتی ہیں۔

سوال نمبر :2 منتخب عنوانات پر نوٹ 20) نمبر(

سوال نمبر :2 مندرجہ ذیل عنوانات میں سے کسی دو پر نوٹ لکھیں۔) الف (تعارفِ نظم تصویرِ درد) ب (تعارف اسرار و رموز) ج (تعارف زبورِ عجم۔(20)

تمہید و تعارف

اس سوال میں تین منتخب کتابوں و نظم کے تعارف درکار ہیں جن میں سے کسی دو پر نوٹ لکھنا ہے۔ سہولت کے لیے یہاں تینوں عنوانات پر نوٹ پیش کیے جا رہے ہیں۔ تصویرِ درد اقبال کی ابتدائی اردو نظم ہے، جبکہ اسرار و رموز اور زبورِ عجم ان کی فارسی شاعری کے شاہکار ہیں۔ ان تینوں کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اقبال کا سفر درد و احساس سے شروع ہو کر ایک مکمل فلسفیانہ نظام تک کیسے پہنچا، اور یہ کہ فارسی زبان ان کے پیغام کی توسیع کا ذریعہ کیسے بنی۔

)الف (تعارفِ نظم تصویرِ درد

تصویرِ درد علامہ اقبال کی ابتدائی دور کی مشہور نظم ہے جو بانگِ درا میں شامل ہے۔ یہ اقبال کے اس دور کی یادگار ہے جب وہ محض ایک حساس شاعر کی حیثیت سے انسانیت کے دکھ درد کو محسوس کر رہے تھے اور ملت کی حالت ان کے دل پر تصویر کی طرح نقش ہو رہی تھی۔ نظم کا عنوان ہی اس کے موضوع کی وضاحت کرتا ہے :شاعر ایک مصور کی طرح درد کی تصویر کھینچتا ہے اور قاری کو دکھاتا ہے کہ اس کے اردگرد پھیلی ہوئی بے حسی، غفلت اور محرومی کا اصل سبب درد مندی کا فقدان ہے۔ اقبال کے نزدیک درد محض ایک رونے دھونے والا جذبہ نہیں بلکہ زندگی کی حرکت و توانائی کا سرچشمہ ہے؛ جو دل درد سے خالی ہو وہ پتھر کے برابر ہے۔ اس نظم میں اقبال نے اس درد کو ذاتی آسودگی کے بجائے اجتماعی بیداری کا ذریعہ قرار دیا ہے۔

فنی اعتبار سے تصویرِ درد میں اقبال کا ابتدائی اسلوب نظر آتا ہے جس میں رومانوی رنگت، منظر کشی اور جذباتی لَے غالب ہے، مگر اسی میں ان کی آئندہ فکری شاعری کی اَبتدائی کرنیں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ نظم کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اس میں اقبال نے درد کو ساری کائنات کا رشتہ قرار دیا ہے؛ جس طرح قطرہ دریا سے جڑ کر معنی پاتا ہے، اسی طرح فرد کا درد پوری ملت کے درد سے جڑ کر اسے مقصد عطا کرتا ہے۔ یہی سوچ بعد میں رموزِ بے خودی کے فلسفے میں ڈھلی۔ آج بھی یہ نظم اس لیے اہم ہے کہ یہ جدید دور کی بے احساسی کے مقابلے میں انسان دلیل، درد مندی اور احساسِ ذمہ داری کا درس دیتی ہے۔ طالب علم کے لیے اس نظم کا مطالعہ اقبال کے فکری ارتقا کے آغاز کو سمجھنے کے لیے ناگزیر ہے۔

ب) تعارف اسرار و رموز

اسرار و رموز سے مراد اقبال کی دو فارسی مثنویاں اسرارِ خودی(1915) ء اور رموزِ بے خودی(1918) ء ہیں، جنہیں ملا کر اقبال کے فلسفے کا مکمل نظام قرار دیا جاتا ہے۔ دونوں مثنویاں مولانا روم کی مثنوی کی بحر) بحرِ رمل (اور اسلوب میں لکھی گئی ہیں اور اقبال نے انہیں مولانا رومی کی روحانی نسبت سے منسوب کیا ہے۔ اسرارِ خودی میں انفرادی خودی کی تعریف، اس کی تربیت کے تین مراحل اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہی، اور خودی کو مضبوط و کمزور کرنے والے عوامل بیان ہوئے۔ رموزِ بے خودی میں یہ بتایا گیا کہ فرد کی تکمیل ملت میں شامل ہونے سے ہوتی ہے اور ملتِ اسلامیہ کی زندگی توحید، رسالت اور کتاب پر قائم ہے۔ پہلی کتاب فرد کو بناتی ہے، دوسری اسے جماعت میں سمو دیتی ہے۔

ان کتب کی اہمیت محض فلسفیانہ نہیں بلکہ تاریخی بھی ہے۔ اسرارِ خودی کا انگریزی ترجمہ پروفیسر نکلسن نے The Secrets of the Self کے نام سے1920 ء میں شائع کیا جس سے اقبال عالمِ اسلام سے نکل کر عالمی سطح کے مفکر بن گئے۔ مغرب کے متعدد دانشوروں نے ان کتب پر مضامین لکھے اور مشرق کے علماء و صوفیا نے بھی ان پر بحث کی؛ بعض حلقوں نے اقبال کے تصورِ خودی پر تنقید بھی کی، جس کے جواب میں اقبال نے اپنے خطوط و خطبات میں وضاحتیں پیش کیں۔ اسرار و رموز نے اردو و فارسی ادب میں فلسفیانہ مثنوی کی روایت کو از سرِ نو زندہ کیا اور ثابت کیا کہ شاعری محض جذبات کا اظہار نہیں، ایک پوری قوم کی زندگی کا نظام بھی پیش کر سکتی ہے۔

ج) تعارف زبورِ عجم

زبورِ عجم اقبال کا فارسی شعری مجموعہ ہے جو1927 ء میں شائع ہوا۔ زبور حضرت داؤد پر نازل شدہ کتاب کا نام ہے اور اقبال نے اپنے اس مجموعے کو اسی نسبت سے زبورِ عجم کہا، یعنی عجم کے لیے وہی نغمۂ حیات جو بنی اسرائیل کے لیے زبور تھی۔ اس کتاب کے چار حصے ہیں :پہلے دو حصوں میں غزلیات ہیں جن میں عشق و خودی کے مضامین بلند آہنگ فارسی غزل کی روایت میں بیان ہوئے ہیں؛ تیسرا حصہ مثنوی گلشنِ رازِ جدید ہے، جس میں اقبال نے شیخ محمود شبستری کی مشہور مثنوی گلشنِ راز کے سوالات کو جدید دور کے تناظر میں از سرِ نو جواب دیے ہیں؛ اور چوتھا حصہ مثنوی بندگی نامہ ہے جس میں غلامی کی نفسیات و اسباب اور اس کے علاج پر گفتگو کی گئی ہے۔

زبورِ عجم کی غزلوں کو فارسی غزل کی تاریخ میں اہم مقام حاصل ہے کیونکہ اقبال نے غزل کی روایتی علامتوں حسن و عشق کو اپنے فلسفۂ خودی کے تابع کر کے انہیں ایک نئی معنویت بخشی۔ بندگی نامہ اس لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا

ہے کہ اس میں اقبال نے بتایا کہ غلام قومیں کس طرح اپنے آقاؤں کی تہذیب، فکر اور مذہب تک کو اپنا لیتی ہیں اور یہ ذہنی غلامی جسمانی غلامی سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر زبورِ عجم اس بات کا ثبوت ہے کہ اقبال فارسی زبان پر کامل قدرت رکھتے تھے اور انہوں نے فارسی شاعری کی کلاسیکی روایت کو جدید فکر کا ترجمان بنا دیا تھا۔ یہی کتاب ان کے اس دعوے کی عملی مثال بھی ہے کہ ان کا کلام اردو سے زیادہ فارسی میں ہے، کیونکہ ان کا مخاطب پورا عالمِ اسلام تھا۔

خلاصہ و نتیجہ

ان تینوں تعارفوں سے اقبال کے کلام کے تین مراحل روشن ہوتے ہیں: تصویرِ درد میں احساسِ درد کی جھلک، اسرار و رموز میں اس احساس کا فلسفیانہ نظام، اور زبورِ عجم میں اس نظام کا فارسی ادب کی عظیم روایت میں ڈھل جانا۔ امتحانی نوٹ لکھتے ہوئے ہر کتاب کا سنِ اشاعت، زبان، حصے و مندرجات اور بنیادی پیغام ضرور نمایاں کرنا چاہیے، کیونکہ تعارفی نوٹ کی خوبی اسی اختصار و جامعیت میں ہوتی ہے۔

سوال نمبر 3: نظم طلوعِ اسلام کا فکری و فنی جائزہ (نمبر 20)

سوال نمبر 3: اقبال کی نظم طلوعِ اسلام کا فکری و فنی جائزہ پیش کریں۔(20)

تمہید و تعارف

طلوعِ اسلام اقبال کی مشہور ترین نظموں میں سے ہے جو بانگِ درا میں شامل ہے اور1923ء میں انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے میں پڑھی گئی۔ اس نظم کا پس منظر پہلی جنگِ عظیم کے بعد کا وہ دور ہے جب عالمِ اسلام ہر طرف سے زوال و انتشار کا شکار تھا، مگر عین اسی زمانے میں اناطولیہ میں مصطفیٰ کمال کی قیادت میں ترکوں نے یونانی جارحیت کو شکست دے کر نئی امید پیدا کر دی تھی۔ اقبال نے اس کامیابی کو محض ترکی کی فتح نہیں بلکہ اسلام کے نئے طلوع کی نوید قرار دیا۔ اس جائزے میں پہلے نظم کے فکری پہلوؤں اور پھر اس کی فنی خصوصیات کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

جدول 1: طلوعِ اسلام کی نمایاں علامتیں اور ان کے مفاہیم

فکری مفہوم	ظاہری معنی	علامت
احیائے اسلام و ملت کی بیداری	دن کا آغاز	صبح / طلوع

زوال کی انتہا اور امید کی دلیل	رات کے آخری ستارے	ستاروں کی تنک تابی
خونِ شہید اور قربانی	سرخ پھول	لالہ
صداقت، عدالت، شجاعت پر مبنی قیادتِ عالم	قیادت	امامت

فکری جائزہ :امید و بیداری کا پیغام

طلوعِ اسلام کا بنیادی فکری نقطہ مایوسی کے انکار اور امید کی تصدیق ہے۔ نظم کا آغاز ہی اس مصرعے سے ہوتا ہے کہ دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی، یعنی رات کے آخری ستاروں کی مدھم روشنی خود اس بات کی دلیل ہے کہ صبح قریب ہے۔ اقبال مسلمانوں کو بتاتے ہیں کہ ان کی موجودہ حالت زوال کی آخری گھڑی ہے، کیونکہ تاریخ کا قانون یہ ہے کہ گھنی تاریکی کے بعد ہی روشنی آتی ہے۔ وہ ترکوں کی فتح کو اسلام کی اسی صبح کی تمہید قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عالمِ اسلام پر ایک نیا دور شروع ہونے والا ہے۔ نظم میں اقبال نے واضح کیا کہ یہ طلوع کسی ایک ملک کی فتح سے مکمل نہیں ہوگا بلکہ اس کے لیے پوری ملت کو اپنی روش بدلنا ہوگی۔

نظم کا دوسرا بڑا فکری پہلو خودی وتجدیدِ ملت کا درس ہے۔ اقبال مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ طلوعِ اسلام کا انحصار ان کے اپنے کردار پر ہے :سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا، لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا۔ اس شعر میں اقبال نے امامتِ عالم کی شرطیں گنوا دی ہیں یعنی صداقت، عدالت اور شجاعت۔ اس کے علاوہ نظم میں شہداء کے خون کی قدر و قیمت، لالے کو شہید کے خون کی علامت بنانا، اور اتحادِ ملت کی تاکید جیسے مضامین آئے ہیں۔ اقبال کے نزدیک ترکوں کی کامیابی اسی لیے ممکن ہوئی کہ انہوں نے مایوس ہونے کے بجائے عمل اور قربانی کا راستہ اپنایا۔ یہی فکر نظم کو ایک سیاسی تبصرے سے بڑھا کر ایک آفاقی تحریکی دستاویز بنا دیتی ہے۔

فنی جائزہ :اسلوب، علامتیں اور ترکیب

فنی اعتبار سے طلوعِ اسلام اقبال کے فن کا شاہکار ہے۔ نظم مسدس نما بندوں میں لکھی گئی ہے اور ہر بند کا اختتام ایک تیز آہنگ اور پُراثر شعر پر ہوتا ہے، جس سے خطیبانہ لے اور جوش میں اضافہ ہوتا ہے۔ اقبال نے روشنی و تاریکی کی علامتوں کو پوری نظم کی بنیادی ساخت بنایا ہے :شب، ستارے، تنک تابی، صبح، آفتاب اور لالہ، یہ سب ایک ہی استعاراتی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ لالے کا پھول خونِ شہید کی سرخی کی علامت بن کر آتا ہے اور صبح کی سرخی سے ہم

آہنگ ہو جاتا ہے۔ یہ علامتی ہم آہنگی نظم کو محض اشعار کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک مکمل شعری تصویری نظام بنا دیتی ہے، جو فنی پختگی کی عمدہ مثال ہے۔

زبان و بیان کے لحاظ سے نظم میں فارسی تراکیب، قرآنی و تاریخی اشارے اور خطابت کی قوت نمایاں ہے۔ اقبال کی آواز اس نظم میں ایک واعظ و رہنما کی آواز ہے جو مجمع سے براہِ راست مخاطب ہوتا ہے؛ اسی لیے یہ نظم سٹیج سے پڑھنے پر غیر معمولی اثرانگیز ثابت ہوئی اور سامعین پر وجدانی کیفیت طاری کر دیتی تھی۔ تنقیدی نقطہ نگاہ سے بعض نقادوں نے اقبال کے خطیبانہ انداز پر یہ اعتراض بھی کیا کہ اس میں شعریت پیغام کے تابع ہو جاتی ہے، لیکن طلوعِ اسلام کی صورت میں پیغام اور فن اس قدر ہم آہنگ ہیں کہ نظم دونوں محاذوں پر کامیاب قرار پاتی ہے۔ ترکیب، اختتامی اشعار کی ترنم انگیز ترتیب اور منظر سے معنی کی طرف بتدریج رجحنا، یہ سب فنی خصوصیات اس نظم کو بانگِ درا کی نمایاں ترین نظموں میں شامل کرتی ہیں۔

اس کے علاوہ نظم کی صوتی تنظیم بھی فنی جائزے کا اہم حصہ ہے۔ اقبال نے اس نظم میں ردیف و قافیے کی پابندی کو موسیقیت پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا ہے اور بند کے آخری شعر کو نعرے کی طرح بلند آہنگ رکھا ہے تاکہ مجمع پر اس کا اثر گہرا ہو۔ نظم کا آغاز بظاہر مایوس کن منظر سے ہوتا ہے، مگر ہر بند کے ساتھ امید کا درجہ بلند ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ آخری اشعار میں شاعر کا لہجہ یقین اور سرشاری کی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ منظر سے معنی اور معنی سے عزم تک کا یہ سفر فنی شعور کی دلیل ہے۔ نقادوں نے یہ بھی نشاندہی کی ہے کہ اس نظم میں اقبال نے تاریخ) ترکوں کی فتح (سے علامت) اسلام کا طلوع (اور علامت سے پیغام) خودی کی بیداری (کی طرف جس صفائی سے سفر کیا ہے، وہ ان کے فن کی وہی پختگی ہے جو بعد میں مسجدِ قرطبہ اور ساقی نامہ میں اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔

قابلِ ذکر ہے کہ طلوعِ اسلام کو اقبال نے خضرِ راہ کے ایک سال بعد اسی انجمن کے پلیٹ فارم سے پیش کیا، مگر دونوں نظموں کے مزاج میں نمایاں فرق ہے :خضرِ راہ میں سوالات اور درد کا غلبہ ہے جبکہ طلوعِ اسلام میں جوابات اور یقین کی روشنی ہے۔ یہ ترتیب خود اقبال کے فکری سفر کو ظاہر کرتی ہے کہ پریشان کن سوالات کے بعد شاعر ایک پختہ نتیجے تک پہنچ گیا تھا۔ نظم میں تاریخی شعور بھی فنی حسن کے ساتھ چلا ہے؛ اقبال ماضی کی عظمت کا نوحہ نہیں پڑھتے، حال کی کامیابی کو مستقبل کے عزم میں بدلتے ہیں۔ اسی توازن نے اس نظم کو وقتی سیاسی نظم بننے سے بچا لیا اور اسے

ہر اس دور کے لیے قابلِ مطالعہ بنا دیا جب مسلمان کسی زوال کے بعد اٹھنے کا ارادہ کریں، کیونکہ اس میں فتح کا جشن نہیں، فتح کے بعد کی ذمہ داری کا احساس ملتا ہے۔

خلاصہ و نتیجہ

حاصل یہ ہے کہ طلوعِ اسلام فکری طور پر امید، قربانی اور تجدیدِ ملت کا منشور ہے اور فنی طور پر علامتی نظام، خطیبانہ لہجے اور موزوں ساخت کا حسین امتزاج۔ اس نظم نے1923ء کے مایوس ماحول میں مسلمانوں کو بتایا کہ ان کا مستقبل تاریک نہیں بلکہ ان کے اپنے کردار سے وابستہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نظم سو سال گزرنے کے باوجود آج بھی اسی تازگی کے ساتھ پڑھی جاتی ہے اور اقبال کی ملت ساز شاعری کی سب سے روشن مثال مانی جاتی ہے۔

سوال نمبر 4: علامہ اقبال کی نظم نگاری (20 نمبر)

سوال نمبر :4 علامہ اقبال کی نظم نگاری پر مضمون تحریر کیجیے۔(20)

تمہید و تعارف

اردو ادب میں اقبال کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے نظم کو غزل کی صدیوں سے چلی آتی ہوئی موضوعاتی فضا سے نکال کر اسے قوم کی زندگی، تاریخ اور مستقبل سے جوڑ دیا۔ اقبال سے قبل اردو نظم میں اخلاقی، عشقیہ اور منظر نگاری کے موضوعات غالب تھے اور سر سید و حالی نے نظم کو مقصدیت سے آشنا کیا تھا، مگر نظم کو ایک مکمل فکری نظام اور انقلابی آواز کی صورت اقبال ہی نے دی۔ ان کی نظم نگاری کا مطالعہ موضوعات، ہیئت و اسلوب اور فنی تکنیک کے حوالوں سے کیا جا سکتا ہے، جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

موضوعات کا تنوع اور فکری گہرائی

اقبال کی نظموں کے موضوعات حیرت انگیز تنوع رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں بچوں کی نظمیں بھی ہیں، مثلاً بچے کی دعا) لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری(، جن میں معصومیت اور بلند اخلاقی مقاصد کا حسین امتزاج ہے۔ فطرت کی نظموں میں ہمالہ، آفتاب اور ابر کوہسار جیسی نظمیں فطرت کو محض منظر نہیں بلکہ خدا کی قدرت کی نشانی کے طور پر پیش کرتی ہیں۔ قومی و ملی نظموں میں ترانۂ ہندی، ترانۂ ملی، شکوہ، جوابِ شکوہ، خضرِ راہ اور طلوعِ اسلام جیسی شاہکار شامل ہیں جنہوں نے پورے برصغیر کے مسلمانوں کو بیدار کیا۔ فلسفیانہ نظموں میں سماع، وقت، مسجدِ قرطبہ اور

ساقی نامہ انسان و کائنات کے بڑے سوالات کو شعری قالب میں ڈھالتے ہیں۔ گویا زندگی کا کوئی اہم گوشہ ایسا نہیں جس پر اقبال نے نظم نہ لکھی ہو۔

اس تنوع کے باوجود اقبال کی تمام نظموں کو ایک مرکزی دھاگے نے باندھ رکھا ہے اور وہ ہے خودی، عشق اور عمل کا پیغام۔ ابتدائی نظموں میں جہاں وطنیت اور انسان دوستی کا رنگ غالب تھا، وہاں بعد کی نظموں میں ملتِ اسلامیہ کی بیداری اور پھر انسان کی عظمت کا آفاقی تصور نمایاں ہوا۔ اقبال کی نظم محض جذبے کا اظہار نہیں ہوتی بلکہ ایک باقاعدہ دلیل و فکر پر کھڑی ہوتی ہے؛ یہی سبب ہے کہ ان کی طویل نظمیں ایک نشید کی طرح شروع ہو کر ایک فکری نتیجے پر اختتام پاتی ہیں۔ نقادوں نے درست کہا ہے کہ اقبال اردو کے وہ واحد بڑے شاعر ہیں جن کی نظموں کو پڑھ کر ایک مکمل فلسفۂ حیات حاصل کیا جا سکتا ہے۔

ہیئت، اسلوب اور فنی تکنیک

ہیئت کے اعتبار سے اقبال نے اردو نظم کی تمام مروجہ صورتوں کو کامیابی سے آزمایا: مسدس، مثنوی نما پابند نظم، مکالمانہ نظم، قطعات اور مختصر نظمیں۔ شکوہ و جوابِ شکوہ مسدس کی عمدہ مثالیں ہیں جن میں چھ مصرعوں کے بند تسلسل سے ایک عظیم الشان منظرنامہ ترتیب پاتے ہیں۔ خضرِ راہ اور لینن خدا کے حضور میں کی طرح اقبال نے مکالمانہ تکنیک کو اختیار کیا جس سے نظم میں ڈرامائی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ مسجدِ قرطبہ میں ہشت پہلو بندوں کی تنظیم فنی کمال کی دلیل ہے۔ اقبال بحور کے انتخاب میں بھی موضوع سے ہم آہنگی رکھتے تھے؛ جوشیلی نظموں کے لیے رواں و تیز بحریں اور تاملات کے لیے ٹھہراؤ والی بحریں منتخب کرتے تھے۔

اسلوب کے لحاظ سے اقبال کی نظم نگاری کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں :فارسی تراکیب و الفاظ کا وافر استعمال جس سے زبان میں وقار و وسعت پیدا ہوتی ہے؛ علامت و استعارے کا نظام، مثلاً شاہین، لالہ، چراغ، ساحل و سمندر؛ خطابت و ندا کا انداز، جیسے اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو؛ قرآنی آیات، احادیث اور تاریخی شخصیات کے حوالے؛ اور امثال و محاورات کی طرح ضرب الامثال بن جانے والے اشعار، جیسے خودی کو کر بلند اتنا۔ بعض نقادوں نے اقبال کے ہاں خطابت کے غلبے اور خیال کی تکرار کو کمی قرار دیا ہے، مگر مجموعی جائزہ یہ ہے کہ یہی باتیں ان کی نظموں کو سٹیج و مجمع اور کتاب، ہر دو سطحوں پر کامیاب بناتی ہیں۔ ان کی نظم پڑھنے اور سننے، دونوں حالتوں میں مؤثر رہتی ہے، جو اردو نظم میں کم شعرا کو نصیب ہوا۔

اقبال کی نظم نگاری کا ایک اور اہم پہلو ان کی کردار نگاری اور منظر سازی ہے۔ لینن خدا کے حضور میں بولتا ہے، خضر راہنمائی کرتا ہے، بچہ دعا کرتا ہے، اور بلبل و گل اپنی علامتی زبان میں وقت کے مسائل بیان کرتے ہیں۔ یہ کرداری تنوع نظم کو جامد خطبے کے بجائے زندہ ڈرامے کی صورت دیتا ہے۔ اسی طرح مکانی منظر کشی میں قرطبہ کی مسجد، ہسپانیہ کا دریا اور ہمالیہ کی چوٹیاں محض جغرافیہ نہیں رہتے بلکہ تاریخ و تہذیب کی علامتیں بن جاتے ہیں۔ اقبال کی نظموں کی مقبولیت کا راز بھی یہی ہے کہ وہ سننے والے کو ایک منظر میں کھڑا کر کے اس سے ایک فیصلہ مانگتی ہیں؛ قاری نظم ختم کر کے وہی نہیں رہتا جو نظم شروع کرتے وقت تھا۔ یہی انقلابی تاثر ان کی نظم نگاری کو اردو ادب میں ہمیشہ ممتاز رکھے گا اور ہر نئے دور کا قاری ان نظموں میں اپنے زمانے کے سوالات کا جواب تلاش کرتا رہے گا۔

اقبال کی نظم نگاری کا تاریخی جائزہ لیا جائے تو یہ ارتقا تین ادوار میں بانٹا جا سکتا ہے۔ پہلے دور میں ہمالیہ اور بچوں کی نظموں جیسی سادہ و دلکش تخلیقات ہیں جن میں فطرت و اخلاق کا درس ہے۔ دوسرے دور میں شکوہ، جوابِ شکوہ، خضرِ راہ اور طلوعِ اسلام جیسی قومی نظمیں آتی ہیں جن میں تاریخ کا شعور اور ملی درد نمایاں ہے۔ تیسرے دور میں مسجدِ قرطبہ، ساقی نامہ، ذوق و شوق اور لینن خدا کے حضور میں جیسی نظمیں ملتی ہیں جہاں اقبال کا فن و فکر دونوں اپنے عروج پر ہیں اور موضوعات مقامی سے آفاقی ہو گئے ہیں۔ اس ارتقائی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کی نظم نگاری جامد نہیں بلکہ ایک زندہ سفر ہے جس میں ہر منزل پچھلی سے بڑھ کر ہے، اور یہی مسلسل ارتقا کسی بھی شاعر کی عظمت کی اصل کسوٹی ہوا کرتا ہے۔

خلاصہ و نتیجہ

نتیجہ یہ ہے کہ اقبال کی نظم نگاری اردو نظم کی تاریخ کا فیصلہ کن موڑ ہے۔ انہوں نے نظم کو موضوعات کی وسعت، فکر کی گہرائی، علامتوں کا نظام اور عوامی تاثر کا وہ امتزاج عطا کیا جو ان سے پہلے کسی شاعر کے حصے میں نہیں آیا۔ ان کی نظمیں ملت کے لیے بیداری کا نغمہ بھی ہیں اور فرد کے لیے فلسفۂ حیات کی کتاب بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کو شاعرِ مشرق کے ساتھ ساتھ اردو نظم کا سب سے بڑا معمار بھی کہا جاتا ہے۔

سوال نمبر :5 علامہ اقبال کی فارسی شاعری پر نوٹ 20) نمبر(

سوال نمبر :5 علامہ اقبال کی فارسی شاعری پر نوٹ لکھیں۔(20)

تمہید و تعارف

اقبال کی شاعری کا ایک غیر معمولی پہلو یہ ہے کہ ان کے کلام کا بڑا حصہ اردو کے بجائے فارسی میں ہے۔ خود اقبال کا کہنا تھا کہ ان کے مخاطبین صرف ہندوستان کے اردو دان نہیں بلکہ پورا عالمِ اسلام ہے، اور اس زمانے میں فارسی ایران، افغانستان، وسطی ایشیا اور برصغیر کے اہلِ علم کی مشترکہ زبان تھی۔ اس نوٹ میں اقبال کی فارسی تصانیف کا تعارف، فارسی اختیار کرنے کے اسباب اور ان کی فارسی شاعری کی خصوصیات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

فارسی تصانیف کا تعارف

اقبال کی فارسی شاعری کا آغاز مثنوی اسرارِ خودی(1915) ء سے ہوا، جس کے بعد رموزِ بے خودی(1918) ء آئی۔ 1923ء میں پیامِ مشرق شائع ہوا، جو گوئٹے کے مغربی دیوان کے جواب میں مشرق کی طرف سے پیش کیا گیا جواب ہے اور اس میں غزلیات، رباعیات اور افکار کے حصے شامل ہیں؛ اسی کے حصۂ افکار میں تسخیرِ فطرت جیسی مشہور نظم بھی ہے۔ زبورِ عجم(1927) ء میں غزلوں کے ساتھ گلشنِ رازِ جدید اور بندگی نامہ جیسی مثنویاں شامل ہوئیں۔ جاوید نامہ(1932) ء کو اقبال کی فارسی شاعری کا شاہکار اور مشرق کی ڈیوائن کامیڈی قرار دیا جاتا ہے، جس میں شاعر مولانا روم کی رہنمائی میں آسمانی سفر کرتا ہے۔ آخر میں پس چہ باید کرد(1936) ء اور ارمغانِ حجاز(1938) ء کا فارسی حصہ آیا، جو اقبال کی آخری فارسی یادگار ہیں۔

اس فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کی فارسی کتب تعداد اور موضوعات دونوں میں ان کی اردو کتب پر بھاری ہیں۔ ان میں مثنوی، غزل، رباعی اور نظم ہر ہیئت موجود ہے، اور موضوعات میں خودی و بے خودی، غلامی کی نفسیات، مشرق و مغرب کا تقابل، تصوف کی اصلاح اور احیائے ملت جیسے تمام بڑے مباحث شامل ہیں۔ فارسی اہلِ زبان نقادوں، خصوصاً ایرانی اہلِ قلم نے بھی اقبال کی فارسی کو اس حسن و سلاست کی داد دی ہے کہ بعض اوقات یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ کسی غیر اہلِ زبان شاعر کا کلام ہے۔

فارسی اختیار کرنے کے اسباب اور خصوصیات

اقبال کے فارسی میں شاعری کرنے کی پہلی وجہ ان کے پیغام کی عالمگیریت تھی۔ ان کی فکر کا مخاطب پوری امتِ مسلمہ تھی، اور فارسی اس دور میں اس امت کی واحد ادبی و روحانی رابطے کی زبان تھی۔ دوسری وجہ ان کی مولانا رومی سے گہری روحانی نسبت تھی؛ اقبال رومی کو اپنا مرشد مانتے تھے اور انہی کے نقشِ قدم پر مثنویاں لکھیں۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ

فارسی کا مزاج فلسفیانہ و صوفیانہ مفاہیم کی ادائیگی کے لیے خاص طور پر موزوں تھا۔ اقبال کا یہ مشہور شعر اسی کیفیت کا اظہار ہے کہ گرچہ ہندی در شکر فطرت نکوست، طرزِ گفتارِ دری شیرین ترست، یعنی اردو بھی میٹھی زبان ہے مگر فارسی گفتار کا انداز اور بھی شیریں ہے۔

فنی اعتبار سے اقبال کی فارسی شاعری کی بڑی خصوصیت روایت اور جدت کا امتزاج ہے۔ انہوں نے سعدی، رومی، حافظ اور عطار کی کلاسیکی روایت کو اپنایا مگر اس میں جدید دور کے مسائل و خیالات بھر دیے؛ جاوید نامہ میں خلائے آسمانی کا سفر قرونِ وسطی کی معراج نگاری بھی ہے اور جدید انسان کے روحانی بحران کا تجزیہ بھی۔ اقبال کی فارسی میں ایک اور خصوصیت پرجوش تبلیغی لہجہ ہے؛ وہ فارسی غزل کے روایتی مضامین میخانہ و ساقی کو بھی اپنے فلسفے کے رنگ میں رنگ دیتے ہیں۔ نقادوں کے نزدیک اقبال کے بعد فارسی شاعری میں فکری مثنوی کی روایت پھر سے زندہ ہوئی اور برصغیر میں فارسی دان طبقے کا اقبال کے کلام سے لگاؤ اس حد تک بڑھا کہ ان کی وفات پر ایران و افغانستان میں تعزیتی جلسے ہوئے۔

اقبال کی فارسی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے یہ نکتہ بھی سامنے رکھنا چاہیے کہ انہوں نے فارسی کو محض پرانی روایت کی نقل کے لیے نہیں چنا بلکہ اسے جدید فکر کی زبان بنایا۔ پیامِ مشرق کا فارمولا ہی اس کا ثبوت ہے :ایک جرمن شاعر کے مغربی دیوان کے سامنے مشرق کا دیوان رکھنا بذاتِ خود ایک تہذیبی مکالمہ تھا۔ جاوید نامہ میں اقبال نے فلکیات، جدید سائنس کے تصورات اور جدید سیاست کے شخصیات تک کو فارسی مثنوی کے قالب میں ڈھال دیا، جو اس زبان کی وسعت کا زندہ ثبوت ہے۔ اسی طرح ان کی فارسی غزل روایتی محبوب و مے کے استعاروں کو خودی کی بلند پرواز میں بدل دیتی ہے۔ یوں اقبال نے فارسی ادب کو بیسویں صدی میں ایک نیا مقصد، نیا موضوع اور نیا لہجہ عطا کیا، اور یہی ان کی فارسی شاعری کا وہ کارنامہ ہے جسے خود فارسی دان اہلِ قلم نے آج تک تسلیم کیا ہے۔

اقبال کی فارسی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے ان کی رباعیات اور قطعات کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ پیامِ مشرق اور زبورِ عجم کی رباعیوں میں اقبال نے بڑے فلسفیانہ نکات کو چند مصرعوں میں سمیٹا ہے، جس سے ان کی اختصار پسندی اور حکیمانہ گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ارمغانِ حجاز کے فارسی حصے کی رقت و سوز کی کیفیت اردو حصے سے مختلف ہے؛ وفات سے کچھ پہلے لکھی گئی یہ شاعری زیادہ باطنی اور مناجاتی رنگ لیے ہوئے ہے۔ یہ تمام رنگ مل کر اقبال کی فارسی شاعری کو ایک مکمل کائنات بناتے ہیں جس میں فلسفہ بھی ہے، سیاست بھی، تصوف بھی اور شعر کا

خالص حسن بھی۔ اس لیے یہ کہنا درست ہوگا کہ اقبال کی فارسی شاعری نہ ان کی اردو شاعری کا ضمیمہ ہے نہ کسی روایت کی تقلید؛ یہ بذاتِ خود ایک عظیم ادبی ورثہ ہے جس کے بغیر بیسویں صدی کی فارسی شاعری کی تاریخ نامکمل رہتی ہے۔

خلاصہ و نتیجہ

آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کی فارسی شاعری ان کی شاعری کا نصف سے زیادہ اور فکری اعتبار سے بھاری حصہ ہے۔ اسرارِ خودی سے ارمغانِ حجاز تک پھیلی یہ کتاب اقبال کے فلسفے کا اصل ذخیرہ ہیں اور یہی وہ ذریعہ ہیں جن کے سبب اقبال کا پیغام برصغیر سے نکل کر پورے عالمِ اسلام اور پھر عالمی ادب تک پہنچا۔ کسی بھی طالب علم کے لیے اقبالیات کی مکمل سمجھ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ ان فارسی تصانیف کی عمومی واقفیت حاصل نہ کر لے۔

AIOU LIBRARY aioulibrary.com